اسوۂ حسنہ تعلیمی، دعوتی اور انتظامی منہج کا مطالعہ

*محمد یوسف فاروقی

Abstract

This Article divided into two parts. The first part deals with the foundational pillars upon which the Prophet (PBUH) built up the early Islamic civilization. The knowledge and understanding of the Prophetic foundation of social and cultural structure deserve serious attention as the uswah (role model) of the Prophet (PBUH) is a normative source and legal authority in Islamic thought.

The second portion of this paper investigates the methodology applied by the Prophet (PBUH) to his educational Scheme, Da'wah Plan and management of the affairs of Muslim Ummah.

Since the role model of the Prophet (PBUH) is an essential source of Islamic legal theory, a humble attempt has been made to explain and elaborate these principles in actions and decisions of the messenger (PBUH).

The aim of this study is to help the contemporary leadership and intellectuals of Muslim Ummah to come forward reawaken and urge people to follow the role model of the Prophet (PBUH) and establish din as it was established by the Messenger (PBUH).

Keywords: Holy Prophet (PBUH), Role Model, Islamic Education, Administration, Preaching

رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اس قدر جامع اور ہمہ گیر ہے کہ جب تک آپ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا جائزہ نہ لیا جائے، اور جب تک انہیں رسالت و نبوت کے پس منظر میں نہ سمجھا جائے، اس وقت تک کسی ایک شعبہ زندگی میں آپ کے کردار اور آپ ﷺ کی عطا کردہ اصلاحات کا صحیح طور پر جائزہ لینا اور اس کی تشریح کرنا مشکل ہے۔

ہم اس مقالہ میں آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی، دعوتی، دستوری اور تنظیمی امور میں رہنمائی اور کارکردگی (contribution) پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں ہم بحیثیت امتِ مسلمہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کا ادراک کر سکیں۔

رسول اللہ ﷺ کی ذات سے ہمارا تعلق ایمان کا ہے۔ ہم آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی انتہائی عقیدت و محبت کے ساتھ نہ صرف مکمل اطاعت کی جائے بلکہ آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ، آپ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کے نظائر کو بھی اپنی عملی زندگی کا حصہ بنایا جائے۔ رسالت مآب ﷺ کا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم آپ ﷺ کے قائم کردہ نظامِ زندگی، آپ کی دعوت اور آپ کی دی ہوئی ہدایات کو ہر دور اور ہر زمانہ میں زندہ و تابندہ رکھیں تاکہ اللہ تعالیٰ کا دین تا قیامت پوری شوکت و عظمت کے ساتھ دنیا بھر کی اقوام اور ساری انسانیت کے لیے روشنی کا مینار بنا رہے۔

---

*سابق ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

رسول اللہ ﷺ نے امت کی تشکیل تین بنیادوں پر فرمائی۔ تشکیل امت کا پہلا بنیادی ستون علم ہے۔ علم کے بغیر نہ امت کا تصور کیا جا سکتا ہے نہ ہی ایک مہذب معاشرہ کا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے سب سے پہلا کام یہ انجام دیا کہ لوگوں کے دلوں میں علم کی اہمیت کو اس قدر اجاگر فرمایا کہ لوگ ذوق و شوق سے طلب علم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نزول قرآن سے متعلق پہلی وحی بھی تعلیم و تعلم، اس کے وسائل و ذرائع کو اپنانے اور بحث و تحقیق کی افادیت اجاگر کرنے اور اہل ایمان کے لیے حصولِ علم کے وجوب کو ثابت کرتی ہے۔

علم وحی علم قطعی ہے:

قرآن حکیم نے دو قسم کے ذرائع علم کی طرف توجہ دلائی ہے۔ دونوں کے مطالعہ کو لازمی قرار دیا ہے۔ پہلا ذریعہ علم وحی الٰہی ہے، یہ علم قطعی کا ماخذ و مصدر ہے۔ اس مصدر سے ضروری علم کا حصول فرض عین ہے۔

وہ تمام بنیادی علم جو انسانیت کی اخروی فلاح و سعادت کے لیے لازمی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو بذریعہ وحی عطا فرمایا۔ عقائد و ایمانیات، عبادات، اخلاقیات، موت کے بعد کے احوال، بعض معاملات سے متعلق احکام و مسائل اور کچھ حلال و حرام کے بارے میں اصولی ہدایات عطا فرمائی ہیں۔ یہ وہ ہدایات ہیں جن تک انسان کا اپنے حواس اور عقلی صلاحیتوں کے ذریعہ پہنچنا مشکل بھی ہے اور ٹھوکریں کھانے اور بھٹکنے کا بھی بہت زیادہ احتمال رہتا ہے۔ پھر یہ ایسی اصولی ہدایات ہیں کہ ان کے بارے میں علم ظنی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان تمام بنیادی معاملات میں علم قطعی کے ذریعہ رہنمائی فرمائی تاکہ ان تمام امور میں انسان پورے اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ عمل پیرا ہو سکے۔

انسان کی فکری اصلاح، استحکام اور ارتقاء کا سب سے اہم ذریعہ ایمان، تعلق مع اللہ، اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت اور اخلاقیات ہیں۔ دین کی ان ہدایات پر عمل پیرا ہوں تو معاشرہ میں اعلی اقدار پر مشتمل ایسی تہذیب پروان چڑھتی ہے جس میں انسان باطنی طور پر پر سکون ہوتا ہے اور ظاہری طور پر اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے پر عزم ہوتا ہے۔

اہل سیاست و قیادت کو یہ بات ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ مندرجہ بالا بنیادی تعلیمات کے بغیر اصلاح معاشرہ کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ محض قانون سازی یا سزاؤں کے ذریعہ بگڑے ہوئے معاشرہ کو سنوارا نہیں جا سکتا، اس لیے کہ قانون یا دستور نہ تو اعلیٰ اقدار پیدا کرتے ہیں نہ ہی ان کی بنیاد پر کوئی تہذیب جنم لیتی ہے۔ دستور اور قوانین تو اس لیے ہوتے ہیں کہ اگر پہلے سے کوئی تہذیب و اقدار موجود ہوں تو ان کا تحفظ دستور و قانون کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔

جس طرح حیاتِ انسانی کے لیے مسلسل آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح انسان کے فکری، عقلی اور روحانی ارتقاء کے لیے مسلسل علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم ضروریات میں شامل ہے۔ لہٰذا جس طرح مقاصد خمسہ کے تحفظ کے لیے تمام ضروری اقدامات کیے جاتے ہیں اسی طرح اسلامی معاشرہ میں علوم کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تربیت کے لیے ہر دور اور ہر زمانہ میں ترجیحی بنیادوں پر اقدامات ضروری ہیں۔ اس لیے کہ علم کے بغیر انسان کے سارے ارتقائی مراحل نہ صرف رک جاتے ہیں

بلکہ وہ رجعت قہقری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم خسارہ سے بچانے کے لیے ابتداء آفرینش سے انسان کو دو قسم کی صلاحیتیں عطا فرمائیں ایک علم وحی کے فہم وادراک اور اس سے بھرپور استفادے کی صلاحیت [1] اور دوسرے اپنی عقل اور حواس کے ذریعہ حصول علم کی صلاحیت، مگر اللہ تعالیٰ کا انعام صرف ان صلاحیتوں تک ہی محدود نہیں رہا اس نے تو براہ راست دونوں قسم کے علوم انسان کو عطا کر دیے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو علم الاسماء یا علم الاشیاء سے نوازا اور نبوت عطا کر کے ایمان، عبادات، ذکر و تسبیح اور تزکیہ و تطہیر قلب اور ظاہر و باطن کی اصلاح کے لیے اخلاقی اصولوں کا علم اور ان کے صحیح فہم کی صلاحیت بھی عطا فرمادی۔ [2]

علم ظنی یا علم بالحواس:

دوسرا ذریعہ علم اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حواس، عقل، تجربہ، شعور، وجدان وغیرہ ہیں۔ یہ حصول علم کے اہم ذرائع ہیں۔ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے اس میں خطا کا امکان ہوتا ہے، اسی لیے ان ذرائع سے حاصل شدہ علم ظنی کہلاتا ہے۔ لیکن ظنی ہونے کے باوجود جب کوئی بات ان ذرائع سے ثابت ہو جائے تو اس وقت تک اس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے جب تک اس کا غلط ہونا ثابت نہ ہو جائے۔ ان ذرائع سے حاصل شدہ علم کو ظنی قرار دینے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بحث و تحقیق کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ اور اہل علم حاصل شدہ علم سے آگے بڑھنے اور نئی نئی چیزوں کی دریافت و جستجو میں لگے رہتے ہیں جس کے نتیجہ میں ہر شعبہ زندگی میں ارتقاء کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت۲۹: ۶۹)(جو لوگ ہم تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں ہم بہت سی راہوں کی رہنمائی کرتے ہیں)۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کی ذات علیم و خبیر ہے۔ علم کے راستوں کی صحیح رہنمائی اسی ذات سے مل سکتی ہے جو ہر وقت ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

ہم نے علم ظنی میں غلطی کے امکان پر بحث کی ہے، اس امکان کو کم سے کم کرنے کے لیے بھی ہدایات ملتی ہیں۔ سب سے مقدم رہنما اصول یہ ہے کہ حواس کے ذریعہ حاصل شدہ علم کو علم وحی کی روشنی میں پرکھنا چاہیے اور اس راہ کی گھاٹیوں کو عبور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد کے لیے اسی کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ انسان اپنی سوچ و فکر میں جوں جوں وحی الٰہی سے قریب تر ہوتا جائے گا، غلطی کا امکان بھی اسی اعتبار سے کم ہوتا جائے گا۔

غلطی کے امکان کو کم کرنے کے سلسلہ میں دوسرا رہنما اصول یہ ہے کہ ہم محض اپنے حواس و علم پر ہی اعتماد نہ کر بیٹھیں بلکہ دیگر اہل علم کو بھی شریک کر لیں اور باہمی مشاورت سے کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کریں، مشاورت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھنے والے اور مختلف پس منظروں کا تجربہ رکھنے والوں کی آراء سامنے آتی ہیں جس کی روشنی میں معاملہ کا ہر پہلو اجاگر ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً اس پہلو کو اختیار کرنا آسان ہو جاتا ہے جو انسانی مصلحتوں کو پورا کرتا ہو۔

قرآن وسنہ اور تعاملِ صحابہؓ سے پتہ چلتا ہے کہ مشاورت کے عمل میں شریک افراد میں تین اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔ پہلی صفت اخلاص ہے کہ اس صفت کے بغیر اسلامی معاشرہ میں کوئی عمل بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ حدیث میں آتا ہے کہ

المستشار مؤتمن[3] (جس سے مشورہ کیا جاتا ہے اس کی حیثیت امین کی ہوتی ہے)۔ امانت داری ایسی صفت ہے جس کا اخلاص کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ دوسری صفت علم ہے کہ جو لوگ مشورہ میں شریک ہوں وہ اس شعبہ سے متعلق علم بھی رکھتے ہوں جس کے بارے میں غور و فکر کیا جارہا ہو۔ دین اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ علمی انداز یا علم پر مبنی رائے کو نظر انداز کر دیا جائے۔ تیسری صفت یہ ہے کہ اپنی رائے کی تائید میں دلیل بھی پیش کی جائے۔ مشاورتی نظم میں وہی رائے قابل اعتناء سمجھی جاتی ہے جو دلیل کے ساتھ ہو۔ دلیل جس قدر قوی ہوگی رائے بھی اسی اعتبار سے وزنی تصور کی جائیگی۔[4]

ایمان:

دین کا دوسرا ابنیادی ستون ایمان ہے۔ ایمان اس عقیدۂ راسخ کو کہتے ہیں جو دل و دماغ میں خوب راسخ ہو چکا ہو اور اس کے اثرات انسان کی عملی زندگی اور اجتماعی زندگی میں نمایاں ہونے لگیں۔ انسان کی فکری اصلاح کا سب سے بڑا ذریعہ ایمان ہی ہے۔ ایمان ہی انسان کی عملی زندگی اور اخلاقی رویہ کو کنڑول کرتا ہے، اس لیے کہ ایمان کا تعلق قلب و دماغ سے ہے۔ متقدمین اہل علم نے تصدیق قلبی کو ایمان قرار دیا ہے، تصدیق کا عمل اسی وقت شروع ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور اس کے مخصوص حقوق کی صحیح معرفت حاصل ہو جائے اور ان پر یقین اس قدر مضبوط ہو جائے کہ پھر زبان سے اقرار بھی ہو، شہادت بھی ہو اور اعضاء و جوارح بھی عمل کے ذریعہ ایمان کی ترجمانی کرنے لگیں۔

ایمان صرف ذات باری تعالیٰ تک محدود نہیں، بلکہ ایمان تو اس مجموعہ کا نام ہے جسے ایمان مفصل میں بیان کیا گیا ہے[5] لیکن تین عقائد بہت بنیادی ہیں، باقی عقائد ضمناً اُن میں شامل ہیں۔ ایمان کا دوسرا حصہ رسالت پر ایمان لانا ہے، اس لیے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ہی مہبط وحی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اپنے خالق و مالک کے سامنے مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دیا جائے، اس کی وحدانیت کو پوری طرح تسلیم کرلے اور اس کے ہر ہر حکم کو برضاء و رغبت قبول کرے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اس کے حکم اور اس کی مشیت کو جاننے کا واحد راستہ رسالت ہے، لہٰذا رسالت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ قرآن حکیم میں بہت سی آیات ہیں جن میں ایمان بالرسول کے ساتھ اطاعتِ رسول کا حکم دیا گیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کی مکمل اطاعت ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔

ایمانیات کا تیسرا بنیادی عقیدہ آخرت پر ایمان ہے، اس میں وہ تمام تفصیلات شامل ہیں جو آخرت سے متعلق ہیں۔ اس میں سب سے اہم عقیدہ بعث بعد الموت اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے تمام اعمال کا حساب و کتاب چکانا شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ہر فرد کی پیشی اور محاسبہ کا یقین دنیوی زندگی میں ہمارے تمام اعمال کو منکر، فحشاء اور بغی و فساد سے ہٹا کر عدل و احسان اور معروف کی طرف موڑ دیتا ہے۔ عقائد و ایمانیات کا یہ مجموعہ ہی حیاتِ انسانی کی فکر، اعمال اور اخلاقی رویوں کو رشد و ہدایت کی راہ پر گامزن رکھتا ہے۔

مکارم اخلاق:

انبیاء علیہم السلام ایمان کی دعوت کے ساتھ سب سے زیادہ زور اخلاقی رویہ کی اصلاح پر دیتے ہیں اس لیے کہ مکارم اخلاق ہی اہل ایمان کے صحیح رویہ کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی تکمیل ہی کو بعثتِ رسول ﷺ کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے تعلیمی و تربیتی منہج میں اخلاقی تعلیم تیسرا بنیادی ستون رہا ہے۔

دین اسلام میں اخلاق اور ایمان کا باہمی تعلق بہت گہرا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ایمان کا تعلق قلب سے ہے، اور اخلاق ایمان ہی کے خارجی ظہور کا نام ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے مروی بہت سی روایات ہیں جن میں مکارمِ اخلاق کو ایمان کا جزو قرار دیا گیا ہے۔ (6)

معلم اخلاق ﷺ نے اخلاقی تربیت کو دو مرحلوں میں ترتیب دیا، پہلے مرحلہ میں باطن کی جلا اور صفائی کی طرف توجہ فرمائی۔ اس مرحلہ میں سب سے اہم کام امراضِ قلبیہ کی تشخیص ہے۔ امراض قلبیہ میں کبر، نفاق، بغض و حسد، غصہ، ریا اور حرص وغیرہ شامل ہیں۔ پہلے مرحلہ میں قلب سے ان امراض کو ختم کیا جاتا ہے پھر عبادات قلبیہ سے قلب کو منور کیا جاتا ہے۔ عباداتِ قلبیہ میں اخلاص، امانت، صدق، شکر، صبر، تقوی، خشوع و خضوع، توکل اور ایثار وغیرہ شامل ہیں۔ قلب مؤمن میں جب یہ اوصاف راسخ ہو جاتے ہیں تو پھر دوسرے مرحلہ میں ظاہری اعمال، عادات و اطوار اور رویہ کی اصلاح بسہولت ممکن ہو جاتی ہے۔

ہم نے امتِ مسلمہ کی تشکیل کے تین بنیادی ستونوں پر مختصر بحث کی ہے۔ یہ وہ بنیادی ستون ہیں جن کی دورِ رسالت کے تیئیس سالہ دور میں ہر لحہ پوری طرح دیکھ بھال بلکہ پورے اہتمام کے ساتھ آبیاری کی جاتی رہی۔ لحہ بھر کے لیے بھی کسی ایک بنیادی ستون کو نہ نظر انداز کیا گیا نہ ہی کمزور پڑنے دیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان تینوں اصولوں کی تعلیم و تربیت کو ہر چیز پر ترجیح حاصل تھی۔ ترجیحات کا اصول بھی ہمیں اسوہ حسنہ میں ملتا ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیمات میں بعض مخصوص حالات میں بعض چیزوں کو ترجیحات میں شامل کیا گیا، لیکن بعض اصول ایسے تھے کہ انہیں ہر وقت، ہر دور اور زمانہ میں ترجیح حاصل رہی، اس لیے کہ یہی امور دین کا اصل الاصول ہیں۔

تعلیم و تربیت کا منہج:

مندرجہ بالا تینوں بنیادی باتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ایک بہت منظم اور مربوط منہج رہا ہے۔ اس نظم اور منہج کا مطالعہ نہ صرف سیرت طیبہ کو سمجھنے میں مدد دے گا بلکہ ہمیں آج اپنے معاشرہ کے ڈھانچہ کو انہی بنیادوں پر تعمیر کرنے میں معین و مددگار بھی ہو گا جن پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور میں اسلامی معاشرہ اور تہذیب و تمدن کو قائم فرمایا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے تعلیم و تربیت کے منہج میں یہ بات سر فہرست رہی ہے کہ جس چیز کی تعلیم دی جائے اس کی اہمیت کو پہلے اچھی طرح اجاگر کر دیا جائے۔ اس لیے کہ جس چیز کی عظمت و اہمیت دل و دماغ میں بیٹھ جاتی ہے اس کے طلب کی خواہش بھی بڑھ جاتی ہے اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد میں بھی خوشی بھی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً علم کی اہمیت تو اسی بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ آغازِ وحی لفظ اقرء سے ہوتا ہے، علم و قلم اور تعلیم مالم یعلم بھی پہلی وحی کا حصہ ہے۔ قلم و کتاب جو تعلیم کا ذریعہ ہیں وحی نے شروع میں ان سے متعارف کرادیا۔ کتاب و قلم کی عظمت اور تقدس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ نے کتاب و قلم کی قسم کھائی ہے۔[7] حضرت آدم علیہ السلام کی ملائکہ پر فضیلت و برتری کو علم کی بنیاد پر ثابت کیا، اور خود براہ راست حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت سے نوازا۔[8]

اسی طرح ایمان کی اہمیت کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا۔ قرآن حکیم نے جنت کی نعمتوں اور آخرت کی تمام تر کامیابی کا دار و مدار ایمان پر رکھا ہے۔ اہل ایمان جنت کی دائمی نعمتوں سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔[9] غزوۂ خیبر کے موقع پر آپ ﷺ نے باقاعدہ اعلان کروایا تھا ألا انه لا یدخل الجنة الا المؤمنون[10] (یاد رکھو جنت میں صرف ایمان والے لوگ ہی جائیں گے)۔

اخلاق کی اہمیت اس طرح اجاگر فرمائی کہ اسے ایمان کا حصہ قرار دیا۔ حضرت شریح کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ قسم کھا کر فرمایا کہ وہ شخص تباہ ہو گیا جس کے شر سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ رہیں، یا لا ایمان لمن لا امانة له[11] (اس شخص کا کوئی ایمان نہیں جس میں امانت داری نہ ہو)۔ اخلاقی اصولوں کی اہمیت کو اجاگر کرنے کا اس سے بہتر اور کون سا طریقہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود اپنی ساری عملی، ظاہری اور باطنی زندگی کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کا نمونہ بنا کر پیش فرمایا۔ ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میری بعثت کا مقصد مکارم اخلاق کی تکمیل ہے، امت کے ایمان کا امتحان اسی میں ہے، اور اطاعت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی اخلاقی رویہ میں پرکھا جا سکتا ہے۔

مقاصد کا تعین:

معلمِ اخلاق کے تربیتی منہج کا دوسرا اصول مقاصد کا تعین تھا۔ علم کے مقاصد، ایمان کے مقاصد اور اخلاقی اصولوں کے مقاصد کا تعین اور ان کی وضاحت رسول اللہ ﷺ کے منہج کا حصہ رہا ہے۔ علم کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ انسان کو اپنی ذات کی معرفت بھی حاصل ہو جائے اور اپنے خالق کی معرفت بھی حاصل ہو جائے۔ دونوں کی معرفت حاصل ہوگی تو وہ حقوق اللہ کو بھی پہچان لے گا اور حقوق العباد کو بھی۔ ایمان کا مقصد فکر کی اصلاح اور اخلاق کا مقصد رویہ کی اصلاح ہے، اور ان سب کا مقصد انسان کی دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی ہے۔

قرآن حکیم نے نبوت کے مقاصد، نماز، روزہ، زکوٰۃ وحج، تخلیق انسانی کے مقاصد کو اسی لیے بیان کیا ہے تاکہ قرآن حکیم پڑھنے والوں اور اس میں غور و فکر کرنے والوں پر واضح ہو جائے کہ مقاصد کا تعین اور ان کا فہم اعمال واحکام کی تکمیل کے لیے انتہائی ضروری ہے۔[12]

تدریج:

معلمِ انسانیت کے تعلیمی منہج کا ایک اہم اصول تدریج رہا ہے۔ تدریج کا اصول نزول قرآن میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ قرآن حکیم خود تدریج کی حکمت کو بیان کرتا ہے کہ ہم نے قرآن حکیم کو تھوڑا تھوڑا اس لیے نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے سنائیں۔[13] قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے صرف صحیفہ یا کتاب کی شکل میں محفوظ نہیں رکھنا چاہتے تھے بلکہ اسے لوگوں کے دل و دماغ میں اور ان کی عملی زندگی میں بھی محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کو اللہ تعالیٰ نے تدریجاً نازل کر کے پورا کر دیا اور اپنی کتاب کو محفوظ فرما دیا: لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا (الفرقان ۲۵: ۳۲) (تاکہ اس قرآن کی وجہ سے ہم آپ کے دل کو مضبوط کر دیں اور اسی لیے اسے ہم ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں)۔

آپ ﷺ نے دعوت دین میں خاص طور پر تدریج کے اصول کو پیش نظر رکھا ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ تم اہل کتاب کے پاس جاؤ گے۔ جب ان سے ملو تو سب سے پہلے انہیں توحید کی دعوت دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور ذات مستحق عبادت نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اگر وہ توحید کو مان لیں اور محمد ﷺ کی رسالت کو تسلیم کر لیں تو پھر انہیں پنج وقتہ نمازوں کی فرضیت کا حکم دینا، پھر جب وہ اسے بھی مان لیں تو پھر انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے مال کی مقررہ مقدار پر زکوٰۃ فرض قرار دی ہے، جو امیروں سے وصول کر کے غرباء میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اگر وہ اس میں بھی تمہاری اطاعت کر لیں تو پھر تم احتیاط سے کام لینا، ان کے اچھے اموال کو زکوٰۃ میں نہ لینا، مظلوم کی بد دعا سے ڈرتے رہنا، اس لیے کہ مظلوم اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔[14]

فتح مکہ کے بعد مشرکین حج کے موقع پر مسلمانوں کے ساتھ حج میں شریک ہوتے تھے۔ ۸ ہجری میں حضرت ابو بکرؓ کی قیادت میں حج کا فریضہ ادا کیا گیا، اس موقع پر مشرکین بھی حج میں شریک تھے۔ سورہ توبہ کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو کچھ احکام دے کر روانہ کیا، اس میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا۔[15] اس طرح حج کی ادائیگی سے مشرکین کو بتدریج روک دیا گیا۔

ترجیحات:

تعلیم و تدریس میں ترجیحات کا تعین بہت ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے نظامِ تعلیم میں کچھ علوم وہ تھے جن کا تعلق لازمی نصاب سے تھا۔ اس میں سر فہرست ایمان کی تعلیم تھی۔ ایمانیات میں توحید و رسالت، اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتب، ملائکہ، آخرت اور تقدیر وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایمان و عقیدہ کی تعلیم اس طرح دی جاتی تھی کہ صاحب ایمان کا دل اندر سے

گواہی دینے لگے، اللہ تعالیٰ کی حقانیت، اس کی توحید، اس کے بھیجے ہوئے رسول، ان کا مقام و حیثیت اور اس کی نازل کردہ کتب وغیرہ سب کی تصدیق دل سے ہونے لگے، زبان اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کرنے لگے اور عملی زندگی ایمان کے تقاضوں کے مطابق ڈھل جائے۔

بنیادی عبادات جو نہ صرف عبد و معبود کے تعلق کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری ہیں بلکہ تزکیہ نفس کے لیے بھی بہت ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کس طرح کی جائے، اس کی تعلیم بھی ہر ایک کے لیے ضروری تھی۔ اسی طرح فضائل اخلاق کی تعلیم بھی ترجیحی بنیادوں پر دی جاتی تھی، اور ہر ایک کے لیے لازمی تھی۔ یہ تین علوم تو سب کے لیے ترجیحی بنیادوں پر لازمی مضمون کے طور پر پڑھائے جاتے تھے، لیکن ان کے علاوہ بھی بہت سے علوم تھے جن کا حصول بھی ضروری تھا۔ ان لازمی علوم کے علاوہ دیگر علوم میں بھی ترجیحات کا تعین کیا جاتا تھا، لیکن ان کا تعین طالب علم کی صلاحیت و مزاج کے مطابق کیا جاتا تھا۔ مثلاً بعض صحابہ کرامؓ کو آپ ﷺ نے مختلف زبانیں سیکھنے کا حکم دیا، حضرت زید بن ثابتؓ نے سریانی زبان رسول اللہ ﷺ کی ہدایت پر سیکھی تھی۔[16] حضرت زید بن ثابتؓ نے نہ صرف سریانی و عبرانی زبانیں سیکھیں بلکہ اس دور کی اہم علمی زبانیں یونانی اور فارسی بھی سیکھ لی تھیں۔ بعض صحابہ کرام کو رسول ﷺ نے علوم القرآن میں اختصاص کی طرف متوجہ کیا۔ ان کے لیے دعائیں کیں۔ کسی کو علوم الحدیث میں مہارت حاصل کرنے کے لیے توجہ دلائی۔ کوئی علم المیراث اور حساب و ریاضی کی طرف متوجہ کیا گیا، کوئی قضاء میں ماہر بن گیا اور کوئی فقہ و احکام میں۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور اور زمانہ کے رائج علوم کی طرف بھی توجہ دی، علم الانساب اس دور کا ایسا علم تھا جس کی افادیت مسلمہ تھی۔ اس علم کے ذریعہ قبائل و شعوب کی تاریخ اور ان کے حالات کو سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس علم کی افادیت کے پیش نظر فرمایا تھا: تعلموا من أنسابكم ما تصلون به ارحامكم[17] (علم الانساب کو پڑھو، اس لیے کہ اسی کے ذریعہ تم آپس میں بہتر صلہ رحمی کر سکتے ہو)۔

علم تاریخ بھی ایک اہم علم ہے، اس علم کے ذریعہ اقوام کو بہت کچھ سیکھنے اور اپنے حالات کو بہتر بنانے کا موقع ملتا ہے، شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک تذکیر بایام اللہ نصیحت حاصل کرنے اور ماضی کے واقعات سے عبرت و سبق حاصل کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ قرآن حکیم نے قوموں کے عروج و زوال اور اس کے اسباب کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بہت سی اقوام کے واقعات قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ اپنی قوم کو جہالت و گمراہی کی ظلمتوں سے نکال کر اسلام کی روشن شاہراہ پر لے آئیں۔ حکم دیا گیا کہ: وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللهِ (اور انہیں اللہ تعالیٰ کے ایام یاد دلایئے)۔

ایام اللہ ہی کو قرآن کریم نے ایک دوسرے انداز میں اس طرح ذکر فرمایا ہے: سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ (النساء ۴: ۲۶) قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الأَرْضِ (آل عمران ۳: ۱۳۷) قرآن حکیم نے یہ اسلوب اختیار کر کے اہل ایمان کو اس بات پر ابھارا ہے کہ وہ تاریخ کا مطالعہ کریں، ان کے آثار کا مشاہدہ کریں اور ان کے حالات و واقعات سے سبق حاصل کریں۔

علم نجوم وافلاک:

علم الافلاک اور علم نجوم کا تعلق قسمتوں کے احوال بتانے یا قسمتوں کو بنانے یا سنوارنے سے نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد ایام، ماہ و سال کا حساب و کتاب رکھنے، وقت کا تعین اور بحر و بر میں راستوں کی تلاش اور جہتوں کے تعین میں سہولت سے ہے۔ یہ باقاعدہ ایک علم ہے۔ اس سے بھر پور فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

عبد الحیٔ الکتانی نے امام سیوطی کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے:

تعلموا من النجوم ما تهتدون به في ظلمات البر والبحر[18] تم علم نجوم حاصل کروتا کہ بحر و بر کی تاریکیوں میں بھی اپنے راستہ تلاش کر سکو۔ اس روایت کی تائید قرآن حکیم کی اس آیت مبارکہ سے بھی ہوتی ہے۔ وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ (النحل۱۶: ۱۶) اور اللہ تعالی نے افلاک میں نشانیاں بنائیں۔ اور لوگ سیاروں سے بھی رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ آج جدید دور میں بھی بری و بحری سفر میں چاند، سورج اور سیاروں کی گردش سے بہت استفادہ کیا جاتا ہے۔ یہ علم چونکہ انسانی تمدن کے ارتقاء کے لیے بہت ضروری تھا۔ اس لیے اللہ تعالی نے حضرت ادریس علیہ السلام کو بذریعہ وحی عطا کیا تھا۔[19] علم نجوم سے استفادہ کی طرف سورہ انعام کی اس آیت مبارکہ میں توجہ دلائی گئی ہے: وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (الانعام۶: ۹۷) وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم سمندر اور خشکی میں اندھیروں میں راستے معلوم کرو۔

دفاع اور حربی حکمت عملی:

بعض صحابہ کرام کو رسول اللہ ﷺ نے فن حرب، دفاع اور جنگی حکمت عملی میں مہارت کے لیے مختص کیے رکھا۔ حضرت خالد بن ولید، حضرت عبیدہ بن الحارثؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبداللہ بن جحشؓ، حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ، حضرت علیؓ وغیرہ فن حرب کے ماہرین تھے۔ بعض صحابہ کرامؓ کو رسول اللہ ﷺ حربی و فنی مہارت حاصل کرنے کے لیے یمن بھیجا تھا، تاکہ وہ وہاں سے منجنیق بنانا سیکھ کر آئیں، اور یہ ہتھیار وہاں سے لے کر بھی آئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ ہتھیار طائف کے معرکہ میں استعمال بھی کیا۔[20]

تیر اندازی اور نشانہ بازی جو اس دور میں حرب و دفاع کے لیے ایک ضروری فن تھا، رسول اللہ نے اپنے صحابہ کو آمادہ کیا کہ وہ اس فن کو سیکھیں۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں باقاعدہ ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان یہ ہے باب التحریض علی الرمی (تیر اندازی پر ابھارنا) اس باب میں امام بخاری پہلے قرآن کریم کی آیت مبارکہ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ (الانفال۸: ۶۰) بیان کرتے ہیں اور پھر متعلقہ روایات ذکر کرتے ہیں۔[21]

کتاب الجہاد میں ہی برچھوں کی مشق، ڈھال، تلوار، خود، زرہ وغیرہ کے استعمال سے متعلق روایات ہیں۔ یہ سب چیزیں اس دور کے حربی ہتھیاروں میں شامل تھیں۔ دور جدید میں حربی ٹیکنالوجی بالکل بدل چکی ہے۔ قدیم ہتھیار بے کار

ہو چکے ہیں۔اصولی طور پر قرآن حکیم اور سنت نبوی ہمیں ہر دور میں اس حربی فن اور دفاعی ٹیکنالوجی کے حصول پر ابھار رہی ہیں جو اس دور میں حرب ودفاع کے لیے مفید اور ضروری ہوں۔ عہد رسالت میں تیر اندازی، گھوڑ دوڑ، پیراکی وغیرہ کے مقابلوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔عبدالحیئ الکتانی نے التراتیب الاداریہ میں عنوان قائم کیا ہے۔ باب امرھم بتعلیم علم الرمایۃ والسباحۃ (رسول اللہ ﷺ کالوگوں کو تیر اندازی اور پیراکی کی تعلیم کا حکم دینا)اس عنوان کے تحت انہوں نے امام بخاریؒ کے باب التحریض علی الرمی سے استدلال کیا ہے کہ امت کو قوت کے حصول کے لیے یہ سب کچھ حاصل کرنا چاہیے۔[22]

سہولت اور مصلحت عامہ:

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ، آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ اور آپ ﷺ کی تعلیمات سے مصلحتِ عامہ اور عوامی سہولت کا اصول نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ تعلیم و تربیت اور دعوۃ دین میں اس اصول کی اہمیت مسلم ہے۔ تیسیر دراصل دین کے اصولِ حکمت اور موعظۂ حسنہ کا تقاضا ہے: ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل۱۶: ۱۲۵)اپنے رب کے راستہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دیجیے اور(اگر بحث ومذاکرات کی نوبت آئے)توان کے ساتھ بحث کا وہ طریقہ استعمال کیجیے جو سب سے بہتر ہو۔انبیاء علیہم السلام کی دو حیثیتیں بہت نمایاں ہوتی ہیں،ایک یہ کہ وہ مبشر(خوشخبری اور بشارت سنانے والا)ہوتے ہیں۔دوسری حیثیت نذیر(متنبہ کرنے والا، تنبیہ کرنے والا) یہ دونوں حیثیتیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ رسول تعلیم و تربیت اور دعوت دین کے کاموں میں سہولت، مصلحت اور مفاد عامہ کو ملحوظ رکھیں۔

امام بخاریؒ، حضرت انس بن مالکؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یسروا ولا تعسروا، وبشروا ولا تنفروا[23] (لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرو، مشکلات پیدا نہ کرو، انہیں خوشخبریاں سناؤ، متنفر نہ کرو)۔

رسول اللہ ﷺ بعض صحابہ کرامؓ کو جب انتظامی، عدالتی، یا تعلیمی ذمہ داریاں سپرد فرماتے تو انہیں خاص طور پر ہدایت فرماتے کہ وہ لوگوں کے ساتھ سہولت اور آسانی کا معاملہ کریں اور دشواری یا مشقت ہر گز پیدا نہ کریں، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ فرمایا تو انہیں ہدایت فرمائی: یسرا ولا تعسرا، بشرا ولا تنفرا[24] (لوگوں کو سہولت مہیا کرنا، مشقت میں نہ ڈالنا، خوشخبری سنانا، متنفر نہ کرنا)۔

دین میں سہولت کا پہلو دراصل اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہے۔قرآن حکیم میں ارشاد ہے: وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف۷: ۱۵۶)میری رحمت ہر چیز کو محیط ہے، یا مثلاً كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام۶: ۵۴)آپ کے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

رب العالمین کی وسیع رحمت کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ دین میں غلو سے اجتناب کیا جائے، اس لیے کہ غلو میں مشقت بھی ہے اور مضرت بھی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اے لوگو دین میں غلو سے اجتناب کرو، اس لیے کہ دین میں غلو و شدت ہی کی وجہ سے پہلی قومیں ہلاک ہوئیں، یہی حکم ہمیں قرآن کریم میں ملتا ہے: يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ (النساء۴: ۱۷۱) اے اہل کتاب! اپنے دین کے معاملہ میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ اظہار رحمت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسانی مصلحت کا اعتبار کیا جائے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: خير دينكم اليسر (تمہارا بہتر نظام زندگی (دین) وہ ہے جس میں آسانی ہو)۔ یا ان الدين يسر[25] (یقیناً دین آسان ہے)۔

دین میں انسانی مصلحتوں کے خیال، سہولت اور آسانی کے تصور نے اس دین کو ایسا قابل عمل بنا دیا ہے کہ یہ دین اب قیامت تک انسانوں کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے کافی ہے، اسی دین اور اسی امت کی بعثت کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ کے وقت دعا کی تھی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ اور اس امت کو امتِ وسط قرار دیا کہ یہ امت نہ دین میں شدت اور غلو اختیار کرتی ہے، نہ ہی سستی و کاہلی کا شکار ہو کر عمل اور اپنے مقاصد و مشن میں کمزوری دکھاتی ہے بلکہ بحیثیت امت وسط شہادتِ حق کی ادائیگی میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔[26] امت مسلمہ امتِ وسط کے مقام پر اس وقت فائز ہوتی ہے جب وہ اپنے اندر پوری طرح اعتدال قائم کر لیتی ہے، اعتدال اس وقت قائم ہوتا ہے جب ایک طرف شدت و غلو سے اجتناب کیا جائے اور دوسری طرف عدل و احسان کا شعور پوری طرح اجاگر کیا جائے۔ بقول ابو السعود، امت وسط ہونے کے لیے اخلاق حمیدہ، خیر و شر کا ادراک، عدل کا شعور اور علم و عمل سے آراستگی ضروری ہے۔[27]

محاسبہ نفس و اعمال:

ایک اور دستوری اور اصولی رہنمائی جو ہمیں رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ سے ملتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں فکری، علمی اور روحانی ارتقاء مسلسل جاری رہنا چاہیے۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ ہر فرد اپنی ذات، اپنی صلاحیتوں اور اپنے اعمال کا جائزہ لیتا رہے، اس جائزہ اور محاسبہ کے نتیجہ میں انسان خوب سے خوب تر کی طرف بڑھتا ہے، اس کا ہر عمل اور ہر قدم کمال کی جانب اٹھتا ہے۔ خواہشات تو انسان میں بے شمار ہو سکتی ہیں۔ ان خواہشات کا مصدر شر بھی ہو سکتا ہے اور خیر بھی ہو سکتا ہے۔ محاسبہ نفس کا اصل مقصد یہی ہے کہ اپنے آپ کو شر کی قوتوں سے بچا کر خیر کی قوتوں کو اپنائے اور اسی کے مطابق اپنے اعمال کو بہتر سے بہتر بنائے۔ خیر اور کمال کی جانب ارتقائی عمل اسی وقت شروع ہوتا ہے جب انسان سوچ سمجھ کر اس کے لیے جد وجہد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بھی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں، وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا ادراک کر کے انہیں دور کرے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اعلیٰ صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے اعمال اور اپنے کاموں کو زیادہ بہتر اور مفید بنا سکے۔ حصولِ کمال کا یہی طریقہ ہے۔[28] تعلیمی نظام میں نہ صرف یہ کہ استاذ اپنے طالب علم کا محاسبہ کرتا ہے بلکہ طالب علم کی تربیت بھی اس انداز سے کی جاتی ہے کہ وہ خود بھی اپنے علم و صلاحیت اور علمی ارتقاء کا جائزہ لیتا رہے۔

مشاورت:

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مختلف صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا، اسے علم و فکر کے ذرائع اور وسائل عطا کیے ہیں۔ وہ مشاہدات اور تجربات سے بہت کچھ سیکھتا ہے، لیکن اپنے تمام علم و فکر، تجربات ومشاہدات کے باوجود، اس کا علم بھی محدود ہوتا ہے اور تجربات بھی، لہٰذا وہ جب اپنے محدود علم، ناقص تجربات اور کمزور مشاہدات کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کرتا ہے تو اس میں خطا اور غلطی کا امکان باقی رہتا ہے۔ اسوہ حسنہ میں مشاورت کا اصول ہمیں بہت مضبوط نظر آتا ہے۔ وہ اسی لیے ہے ہم اپنے معاملات اور امور زندگی سے متعلق فیصلے باہمی مشاورت سے طے کریں تاکہ ہم اپنے فیصلوں میں غلطی یا خطا کے امکان کو جس قدر کم کر سکتے ہیں کر لیں۔ مشاورت سیرت طیبہ کا ایسا اصول رہا ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے مداومت کے ساتھ عمل کیا، اور اپنے صحابہ کرامؓ کی بھی اس طرح تربیت فرمائی وہ بھی اپنے تمام معاملات مشورہ کے ذریعہ طے کیا کرتے تھے۔ امام رازی صحابہ کرامؓ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ انفرادی رائے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے، جب تک کسی رائے پر باہمی مشورہ کے نتیجہ میں اتفاق نہیں ہو جاتا تھا، اس وقت اس پر عمل درآمد نہیں کرتے تھے۔ (29)

شورائی نظام کی وجہ سے اجتماعیت بھی مستحکم ہوتی ہے اور باہمی تعاون و ہمدردی و خیر خواہی کے جذبات بھی بڑھتے ہیں۔ ابو حیان لکھتے ہیں کہ جس معاشرہ میں شورائی نظام قائم ہو وہاں تین اجتماعی فوائد حاصل ہوتے ہیں، ایک اجتماع الکلمہ یعنی باہمی اتفاق اور اجتماعیت اور دوسرے التحاب یعنی باہمی الفت و محبت اور تیسرے التعاضد علی الخیر یعنی بھلائی اور خیر کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد۔ (30)

اجتماعیت اور وحدت میں جو قوت ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں اجماع، قرآن وسنت کے بعد سب سے مضبوط دلیل ہے۔ فقہاء کرام اجماع کو ایک مضبوط دلیل کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ خلفاء راشدین کے عہد میں امتِ مسلمہ کے اجتماعی امور میں اجتہاد بھی اجتماعی ہوتا رہا ہے۔ اجماع اور اجتماعی اجتہاد دونوں کی تکمیل شورائی عمل کے بغیر ممکن نہیں، لیکن جب کسی معاملہ پر اجماع منعقد ہو جائے یا مشاورتی اجتہاد کے نتیجہ میں کوئی مسئلہ طے ہو جائے تو اس پر عمل لازم ہو جاتا ہے، اس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کی زیر قیادت تمام غزوات کا مطالعہ کیجیے، واضح طور پر نظر آئے گا کہ غزوات میں کامیابیوں کے پیچھے مشاورت کا بھرپور اصول کارفرما رہا ہے۔ غزوات میں شریک صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کے تربیت یافتہ ہیں، وہ آپ ﷺ کے طلبہ کی حیثیت رکھتے ہیں، انہیں سے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: أشیروا علی أیها الناس (لوگو مجھے مشورہ دو)۔ یہ ایسا بلیغ اسلوب ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے عام صحابہ کرامؓ سے کس قدر قریبی تعلق رکھا ہوا تھا۔ شوریٰ کے اصول کو ہم نے رسول اللہ ﷺ کے تعلیمی منہج کے ایک اصول کے طور پر بھی ذکر کیا ہے، لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر یہاں ایک مستقل اصول کے طور پر بھی ذکر کر دیا ہے۔

یہ وہ بعض دستوری ہدایات ہیں جو ہمیں رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ اور آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ میں ملتی ہیں۔ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کے ہر ہر پہلو میں ہدایت ورو شنی موجود ہے لیکن ہم نے چند اصولی ہدایات کے لیے آپ ﷺ کے تعلیمی نظم، دعوت دین، اور تبلیغی منہج اور مملکت و معاشرہ کے لیے انتظامی طریق کار کا خصوصی مطالعہ کیا ہے۔ اور حاصل مطالعہ کو اہل علم کے سامنے نہایت عاجزی وانکساری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اطاعتِ رسول ﷺ کا تقاضا یہ ہے کہ ان تمام ہدایات اور آپ ﷺ کے طے کردہ اصولوں کو ہم اپنی زندگی کا واجب العمل حصہ بنالیں اس لیے کہ امتِ مسلمہ کی کامیابی کا راز اسوۂ حسنہ ہی کی پیروی میں مضمر ہے۔

حوالہ جات:

---

1 ایک طرف تنزیل کتاب مبین کو بیان فرمایااس کی آیات میں غور وفکر کی دعوت دی، عمل کو لازمی قرار دیا، دوسری طرف جعل لکم السمع والابصار والافئدہ فرما کر ان اعضاء سے پوری ذمہ داری کے ساتھ استفادہ کی دعوت دی۔ تدبر و تفکر اور عقلی صلاحیت کو استعمال کرکے صحیح نتائج تک پہنچنے، شریعت کے اسرار و حکم اور علمی نکات کو سمجھنے کی اور پھر انہیں اپنی عملی زندگی میں ڈھالنے پر آمادہ کیا گیا ہے۔

2 وعلم آدم الاسماء کلها (البقرہ:۳۱) تفسیر و تشریح کے لیے دیکھیے جصاص، احکام القرآن، دارالکتاب العربی بیروت ۱۴۰۶ھ، ج۱، ص۳۱؛ آلوسی، روح المعانی، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ت ن، ج۱، ص ۲۳۴

3 ابوداؤد، السنن، کتاب الادب، باب فی الشورہ، حدیث نمبر ۵۱۲۸

4 شوریٰ کی کامیابی کے لیے ضروری شرائط، دیکھیے النساء:۱۴۶، الشوری:۱۴، مزید تفصیل کے لیے فاروقی، محمد یوسف، عہد رسالت میں معاشرہ اور مملکت کی تشکیل، اظہار القرآن، لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۱۵۵

5 ایمان باللہ، بالملائکہ، بالکتب، بالرسل، بالیوم الآخر، بالقدر اور بعث بعد الموت کے مجموعہ کا نام ایمان ہے۔

6 مثلاً لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ (امام بخاری الجامع الصحیح، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیہ، حدیث نمبر ۱۳

7 ن، والقلم وما یسطرون (القلم:۱-۲) حم، والکتاب المبین (الزخرف:۱- ۲) الدخان ۴۴: ۱- ۲)

8 البقرۃ:۳۱- ۳۳

9 النساء:۱۲۴، التوبۃ:۱۱۱، ہود:۲۳،۱۰۸، الفرقان:۲۴

10 مولانا بدر عالمؒ، ترجمان السنہ، ج۱، ص۵۰۶، بحوالہ ابن ابی شیبہ، احمد، مسلم، ترمذی، دارمی اور ابن حبان

11 پہلی حدیث کے لیے دیکھیے، امام بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الادب، باب اثم من لا یأمن جارہ بوائقہ؛ دوسری حدیث کے لیے دیکھیے، احمد بن حنبل، مسند ۳: ۱۳۵

12 مقاصد کی اہمیت پر دیکھیے، فاروقی، محمد یوسف، مقاصد نبوت اور مقاصد شریعہ، ایک مطالعہ، السیرہ، عالمی شمارہ ۲۲، ۲۰۰۹ء، کراچی

13 الاسراء:۱۰۶

14 العمری، اکرم ضیاء، Madinan Society at the time of the Prophet، المعہد العالمی للفکر الاسلامی، USA، ۱۹۹۱)ج ۲: ص۲۲۸- ۲۲۹، بحوالہ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج۵، ص۹۹

15 ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج۵، ص۳۸، ابن کثیر نے یہ روایت امام احمد بن حنبلؒ کی المسند سے نقل کی ہے۔

16 العمری، اکرم ضیاء، Madinan Society at the time of the Prophet، المعہد العالمی للفکر الاسلامی، USA، ۱۹۹۱)ج ۲، ص ۲۲۷، بحوالہ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج۵، ص۹۹

17 الکتانی، عبدالحئی، التراتیب الاداریہ، حسن جعنا، بیروت، ت۔ن، ج ۲، ص ۳۰۰

18 الکتانی، عبدالحہ، التراتیب الاداریہ، ج ۲، ص ا

19 حفظ الرحمن سیوہاروی، قصص القرآن، پروگریسو بکس، لاہور، ت۔ن، ج ا، ص ۹۶، کاندھلوی، محمد ادریس، معارف القرآن، مکتبہ عثمانیہ، لاہور ۱۹۸۳ء، ج ۴، ص ۵۰۶

20 غازی، محمود احمد، مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم، تدوین سید عزیز الرحمن، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ ۲۰۰۹ء، ص ۲۶

21 امام بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الجہاد والسیر، باب التحریض علی الرمی

22 الکتانی، التراتیب، ج ۲، ص ۳۱۴

23 امام بخاری، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب ما کان النبی یتخولہم بالموعظۃ والعلم کی لا ینفروا، حدیث نمبر ۶۹، کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا، حدیث نمبر ۶۱۲۴

24 امام بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا، حدیث نمبر ۶۱۲۴، مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الجہاد والسیر، باب فی الامر بالتیسیر، حدیث نمبر ۴۵۲۵

25 بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الایمان، باب الدین یسر، حدیث نمبر ۳۹

26 امت وسط کے لیے دیکھیے، البقرۃ: ۱۴۳، فاروقی، محمد یوسف، عہد رسالت میں معاشرہ اور مملکت کی تشکیل، اظہار القرآن، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲۷- ۱۳۰

27 دیکھیے، تفسیر ابوالسعود، تحقیق عبدالقادر عطاء، مکتبہ الریاض احمدیہ، ۱۹۷۱ء، ج ا، ص ۲۸۵- ۲۸۶

28 مزید دیکھیے، فاروقی، محمد یوسف، عہد رسالت میں مملکت اور معاشرہ کی تشکیل، ص ۷۴- ۷۸

29 الرازی، فخر الدین، التفسیر الکبیر، دیکھیے، تفسیر سورہ شوری ۳۸: ۴۲، ج ۲۷، ص ۱۷۷

30 ابوحیان، البحر المحیط، تفسیر الشوری ۴۲: ۳۷- ۳۸، ج ۷، ص ۵۲۲